بابری مسجد سے دستبرداری
شرعاً جائز نہیں

رحمۃ اللہ علیہ
مولانا عبد العلیم اصلاحی

مکتبۃ الاقصی

بابری مسجد سے دستبرداری

شرعاً جائز نہیں

بجواب

مولانا وحیدالدین خان

(۱۹۹۳ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

سہ نکاتی فارمولہ کے شرعی دلائل
ایک جائزہ

مسئلہ بابری مسجد کو حل کرنے کے لئے مولانا وحیدالدین خان صاحب نے شریعت کی روشنی میں ایک سہ نکاتی فارمولہ پیش کیا۔ اس وقت ہمارے پیش نظر مولانا کے پیش کردہ شرعی دلائل کا جائزہ لینا ہے۔ یہ دلائل ''الرسالہ مئی ۱۹۹۳ء'' میں پیش کئے گئے ہیں۔

دعویٰ

''مسلمان بابری مسجد کے بارے میں اپنے ایجی ٹیشن کو ختم کردیں۔ اب وہ شریعت کی رو سے بالکل حق بجانب ہیں کہ اس معاملہ سے اپنے آپ کو الگ کرکے اس کو مستقبل کے حالات کے حوالہ کردیں۔''

''اگر یہ مان لیا جائے کہ بابری مسجد کو بچانا مسلمانوں کی قومی ذمہ داری تھی، تب بھی موجودہ حالت میں یہ ذمہ داری ان سے ساقط ہوجاتی ہے۔ اب خود شریعت کے حکم اضطرار کے تحت ان کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ بابری مسجد کے مسئلہ سے الگ ہوجائیں تاکہ اپنے آپ کو مزید ذلت اور ہلاکت سے بچاسکیں۔''
(الرسالہ، مئی ۱۹۹۳ء)

مختصراً یہ دعویٰ ہے۔ آگے ہم نمبروار دلیل اور اپنے اشکالات درج کرتے ہیں۔

① ''۶ ردسمبر کے اس واقعہ کے بعد اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے اس لئے اب ہمیں نئے حالات کے مطابق اپنے کام کا نقشہ بنانا ہے۔ ہمارا ایسا کرنا اسلامی شریعت کے عین مطابق ہوگا کیونکہ شریعت کا مستقل اصول ہے کہ حالات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں''۔

(الرسالہ، صفحہ: ۴)

نئے حالات کے مطابق اپنے کام کا نقشہ بنانا بالکل درست ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن مولانا نے کام کا نقشہ بنانے کے نام پر کام کو ختم کرنے کی آواز اٹھائی ہے۔ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ اسی طرح حالات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہے۔ لیکن اس کا ایک محدود دائرہ ہے۔ اس اصول کو ہر جگہ چسپاں نہیں کیا جاسکتا ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلامی تعلیمات کا ماخذ قرآن اور سنت نہیں بلکہ حالات زمانہ ہیں کہ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ یہ بالکل طے شدہ بات ہے کہ حالات کا اثر اجتہادی اور قیاسی امور پر ہوتا ہے۔ مسجد کے تئیں ہماری ذمہ داریاں منصوص ہیں۔ دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ حکم بدلنا الگ چیز ہے اور حکم کا ختم ہونا بالکل الگ چیز ہے۔

مولانا نے اپنے دعویٰ میں ذمہ داری ''حکم'' کے بدلنے کی بات نہیں کہی ہے، بلکہ حکم یعنی ذمہ داری کے ساقط ہونے کی بات کہی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ دعویٰ الگ ہے اور دلیل الگ ہے۔ دونوں میں کوئی مناسبت اور تعلق نہیں ہے۔ دعویٰ اور دلیل میں مناسبت اور مطابقت اس وقت ہوتی جب کہ یہ کہا جاتا کہ شریعت کا مستقل اصول ہے کہ حالات کے بدلنے سے احکام ختم ہوجاتے ہیں اور ذمہ داری ساقط ہوجاتی ہے۔ اس کو مثالوں سے سمجھئے:

مسلم والدین کی خدمت اولاد پر فرض ہے۔ حالات کے تحت یہ فرض بدل سکتا ہے۔ مثلاً کبھی یہ فرض محض منی آرڈر اور ڈرافٹ بھیج دینے سے ادا ہوجائے گا اور کبھی یہ فرض والدین کے سرہانے کھڑے رہنے، منہ میں نوالہ کھلانے، چمچے سے پانی پلانے اور ان کو نہلانے، دھلانے کی شکل میں بدل جائے گا۔ مگر کبھی بھی یہ فرض حالات کے بدلنے سے ساقط نہ ہوگا۔ اگر کوئی بیٹا حالات کے بدلنے سے استدلال کرے کہ اب میرے تئیں کوئی ذمہ داری نہیں ہے تو یہ اس کا عذر لنگ ہوگا۔

اسی طرح مسجد کے تعلق سے ذمہ داری کبھی اس کو صاف ستھرا رکھنا اور آباد رکھنا ہوگی، کبھی اس کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہوجانا ہوگی اور کبھی از سر نو اس کو تعمیر کرنا ٹھہرے گی۔ یعنی حالات کی تبدیلی سے ذمہ داری کی نوعیت میں تبدیلی ہوسکتی ہے لیکن حالات کی تبدیلی سے ذمہ داری ہرگز ختم نہیں ہوسکتی۔

مولانا نے خود اسی مضمون میں اعتراف کیا ہے کہ متفقہ طور پر شریعت کا یہ حکم ہے کہ جس جگہ جائز طور پر ایک مسجد بنادی جائے وہ جگہ ہمیشہ کے لئے مسجد کی جگہ ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں کو اس میں تبدیلی کا کوئی حق نہیں رہتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مسجد کے مسجد ہونے پر حالات زمانہ کے بدلنے کا کوئی اثر نہیں پڑتا تو اس کی حفاظت وصیانت اور آبادکاری کی ذمہ داری کس پر آئے گی۔ مسلمان ہوتے ہوئے اور اس کو مسجد تسلیم کرتے ہوئے اس سے دست کش

اور بے تعلق ہم کیسے ہو سکتے ہیں، اس کو مورتی پوجا کے لئے کیسے دے سکتے ہیں یا اس پر اپنی رضا اور پسند کا اظہار کیسے کر سکتے ہیں؟ بالخصوص جب کہ قرآن نے مساجد کی آبادکاری مسلمانوں کا کام بتایا ہے۔ معلوم ہوا کہ حالات جو بھی ہوں، مسجد مسجد رہے گی اور مسلمان اس سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔ البتہ ذمہ داری کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے ذمہ داری ساقط نہ ہوگی۔

(۲) ''اسلام نتیجہ خیز عمل کی تلقین کرتا ہے جس عمل کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو وہ عمل اسلام کے مطابق نہیں۔''

(الرسالہ)

یہ دلیل مولانا نے اس پس منظر میں پیش کی ہے کہ اب بابری مسجد دوبارہ اپنی جگہ نہیں بن سکتی۔ اس لئے اس سلسلہ میں جدوجہد کرنا بے کار اور بے نتیجہ ہے اور بے نتیجہ عمل سے اسلام منع کرتا ہے۔ لہٰذا اسلام کا تقاضا ہے کہ بابری مسجد کے معاملہ سے مسلمان الگ ہونے کا اعلان کر دیں اور مسجد کے بجائے مندر کی حیثیت کو تسلیم کر لیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام نتیجہ خیز عمل کی تلقین کرتا اور بے فائدہ اور لایعنی عمل سے روکتا ہے۔ لیکن مولانا جیسے لوگوں کو شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ اسلام آخرت میں نتیجہ خیزی کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر کوئی عمل آخرت میں نتیجہ خیز ہونے والا ہے تو دنیا میں بے نتیجہ ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات جب یہ جانتے ہوئے کوئی عمل کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے اس کا نتیجہ صرف آخرت میں نکلے گا تو اس عمل کی قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔

سورۂ اعراف میں ذکر ہے کہ وعظ و نصیحت کرنے والوں سے لوگوں نے کہا: آپ ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کر رہے ہیں جو ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں اور جو اللہ کے عذاب میں گرفتار ہونے والے ہیں تو انہوں نے جواب دیا تاکہ ہم اللہ کے پاس معذرت پیش کر سکیں۔ یہی وہ چیز ہے جو منافقین کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جس کی بناء پر اللہ کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والوں کو بے وقوف ''سفہاء'' کہتے تھے کہ نہ آگے دیکھتے، نہ پیچھے، نہ فائدہ سوچتے نہ نقصان، جان بھی کھپا رہے ہیں اور مال بھی بے دریغ خرچ کر رہے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے مسجد کے لئے کوئی جدوجہد بے نتیجہ نہیں ہے۔

مسجد بنے یا نہ بنے جو لوگ اس راہ میں جان و مال کی قربانی اخلاص نیت کے ساتھ پیش کریں گے ان کا یہ عمل بے انتہاء نتیجہ خیز ہوگا اور ان کی قدر و قیمت بہت بڑھ جائے گی۔ اس لئے کہ انہوں نے مایوس کن اور سخت حالات میں اللہ کے گھر کی تعمیر کے لئے جدوجہد جاری رکھی ہے۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس دنیا کے نتیجہ سے بے پرواہ ہو کر صرف آخرت کے نتیجہ پر نظر جمائے ہوئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ سخت

حالات میں صراط مستقیم پر صبر واستقامت کا پیکر بن کر زمانہ کے دھاروں کا منہ موڑ سکتے ہیں اور جو لوگ اس دنیا میں فائدہ نقصان کا حساب لگاتے رہیں گے وہ چند لمحے بھی راہ راست پر قائم نہیں رہ سکتے۔

مسجد اللہ کے شعائر میں سے ہے۔اس کی بے حرمتی نہیں کی جاسکتی اور نہ اس کی بے حرمتی اور پامالی کو گوارا کیا جاسکتا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُحِلُّوا۟ شَعَٰٓئِرَ ٱللَّهِ (المائدۃ:۲)

ترجمہ:''اے ایمان والو! اللہ کے شعائر کو حلال نہ کرلو۔''

مسجد اللہ کے شعائر میں سے ہونے کی بناء پر احترام اور تعظیم کی مستحق ہے اور اس کی تعظیم ایمان وتقویٰ کی علامت ہے۔

وَمَن يُعَظِّمْ شَعَٰٓئِرَ ٱللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى ٱلْقُلُوبِ (الحج:۳۲)

ترجمہ:''اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا پس وہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔''

مولانا کے سہ نکاتی فارمولہ کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کی بے حرمتی کو گوارا ہی نہیں بلکہ اس پر ہم برضا ورغبت مہر تصدیق لگادے رہے ہیں جبکہ ہم کو اس کی حرمت کو باقی رکھنے اور تعظیم کا حکم دیا گیا ہے۔

تفسیر، حدیث اور تاریخ کے پورے ذخیرہ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ مسلمانوں نے اپنی جان بچانے کے لئے اجتماعی طور پر معصیت کا ارتکاب کیا ہو۔اللہ کے شعائر میں سے کسی چیز کی پامالی کو بطور قیمت ادا کیا ہو۔مرجانا، قتل کیا جانا انہوں نے پسند کیا ہے لیکن اللہ کے دین کو رسواء ہونے نہیں دیا ہے۔

بابری مسجد سے بے تعلق ہونے کو ملک کے (۲۰) کروڑ مسلمانوں کی جان بخشی کے لئے ضروری قرار دے کر گویا سارے مسلمانوں کو ذہنی طور پر تیار کرایا جارہا ہے تیس ہزار مساجد سے بے تعلق ہونے کے لئے۔کیونکہ جس بنیاد پر ایک مسجد کو چھوڑا جاسکتا ہے اس بنیاد پر کسی بھی مسجد کو چھوڑنا جائز ہوگا۔ایک مسجد کو پوری ملت نے حوالہ کیا تو ایک گاؤں اور ایک محلہ کے لوگ اپنی حفاظت کے لئے اپنی مسجد سے دستبردار ہوجائیں تو کسی طرح وہ لائق ملامت نہیں ہوسکتے کیونکہ پوری ملت کی جانب سے بابری مسجد کی حوالگی کا فتویٰ ان کے لئے سند جواز بن جائے گا پھر مسجد چھوڑنا جائز ہوگیا تو اس کے بعد خانقاہ اور قبرستان کی بات ہی کیا رہی۔ان کے لئے معمولی مزاحمت کرنا بھی لوگ پسند نہ کریں گے۔

یہ صحیح نہیں ہے کہ ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء سے پہلے مسئلہ مسجد کی حفاظت کا تھا اور اس کے بعد مسئلہ مسلمانوں کی حفاظت کا ہے۔مسلمانوں کی حفاظت کا مسئلہ جس طرح آج اہم ہے اسی طرح ۶؍دسمبر سے پہلے بھی تھا۔

مسلمانوں کی نسل کشی کا سلسلہ بہت پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ بھاگلپور، میرٹھ، مراد آباد اور بھیونڈی کے فسادات جیسے ان گنت واقعات ہوئے ہیں۔ یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ مسئلہ ۶ ردسمبر کے بعد پیدا ہوا ہے۔ اور بابری مسجد کا نام لینا مسلمان بند کر دیں تو مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ قرائن اور شواہد بتاتے ہیں کہ یہ سلسلہ آسانی سے بند ہونے والا نہیں ہے اور ہمیں یہ سوچ کر آگے چلنا ہوگا کہ بہرصورت ہمیں ایک لمبی مزاحمت اور کشمکش سے گزرنا ہے اس لئے کہ یہ مسئلہ ایک مسجد کا اور مقامی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ اب عالمی سیاست سے جڑ چکا ہے اور پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کی جو کارروائیاں اور سازشیں چل رہی ہیں مسلمانان ہند کے تحفظ کا مسئلہ ان کا ایک جزو ہے۔

بہر حال یہ مسئلہ ہے اور اہم ترین مسئلہ ہے جس کے حل کا طریقہ کتاب وسنت اور اسلامی روایات میں کہیں بھی مسجد یا قبلہ سے دست برداری یا بے تعلقی نہیں بتایا گیا ہے۔

ہمارے تحفظ کا طریقہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیات صاف صاف بتا رہی ہیں۔ آخر قرآنی طریقۂ کار سے صرف نظر کیوں کیا جا رہا ہے؟!

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۔ (سورۂ محمد:۷)

ترجمہ: ”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا۔“

اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے دین کی مدد، اللہ کی کتاب کی مدد، اللہ کے رسول کی مدد اور اللہ کے گھر کی مدد ہے۔ اس روشنی میں پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کی مدد حاصل کرنے کی شکل یہ نہیں ہے کہ مسلمان اللہ کے گھر یعنی مسجد سے دست برداری اختیار کر لیں بلکہ اس کی نصرت اور معیت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے گھر کی حفاظت صیانت اور تعمیر کے لئے آخری دم تک لڑا جائے۔ جب ہی ہم اپنی عزت وناموس کو بھی بچا سکتے ہیں اور تیس ہزار مسجدوں کو محفوظ رکھنے کی توفیق اور قوت پا سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف انسانوں سے ڈر کر اللہ کی مدد یعنی اس کے گھر کی حفاظت اور آبادکاری سے دامن کش ہو جائیں گے تو اللہ کی نصرت سے محروم ہو کر ذلیل و خوار ہو جائیں گے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (آل عمران:۱۶۰)

ترجمہ: ’’اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم سے جیت نہیں سکتا اور اگر تم کو چھوڑ دے تو کون ہے اس کے بعد جو تمہاری مدد کرے اور اللہ ہی پر مسلمانوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔‘‘

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا (النساء:۷۱)

ترجمہ: ’’اے ایمان والو! اپنا بچاؤ اختیار کرو پس نکلو الگ الگ یا جمع ہوکر۔‘‘

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ. (الانفال:۶۰)

ترجمہ: ’’اور ان کے لئے جہاں تک ہو سکے قوت اور پلے ہوئے گھوڑے تیار رکھو، اس کے ذریعہ تم رعب جماؤ گے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اور ان کے علاوہ دوسروں پر جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ ان کو جانتا ہے۔‘‘

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمنوں سے محفوظ رہنے اور باعزت زندگی کے لئے تین کام مسلمانوں کو کرنے ہیں:

① اللہ کے دین کی مدد کرکے اللہ کی مدد حاصل کی جائے اور اس سلسلہ میں صرف اللہ پر بھروسہ کیا جائے۔

② ہوشیار رہا جائے۔ خواب غفلت کو چھوڑ دیا جائے۔

③ جہاں تک ہو سکے قوت اور سامان جمع کیا جائے تاکہ دشمنوں کے دلوں میں رعب بیٹھ جائے۔

مولانا وحید الدین خان صاحب کا سہ نکاتی فارمولہ قرآن کے سہ نکاتی فارمولہ کے بالکل برعکس ہے۔ اسی لئے مسلمانوں نے اس فارمولہ کو بالکل ہی مسترد کر دیا۔

③ مولانا کی تیسری دلیل یہ ہے کہ:

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت قرآن میں جو آیت اتری وہ یہ نہیں تھی کہ:

”طهر الكعبة من الاصنام“...... کعبہ کو بتوں سے پاک کرو۔‘‘

بلکہ یہ کہا گیا کہ:

”وثيابك فطهر“...... ’’اپنے کپڑے کو پاک کرو‘‘۔

’’یعنی اخلاق کو درست کرو۔ مکی دور میں اسی قسم کی آیتیں اترتی رہیں۔ ان کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں تھا کہ کعبہ کے اندر بت رکھنے کا شرعی حکم کیا ہے، بلکہ ان کا تعلق صرف اس مسئلہ سے تھا کہ مکہ جیسے حالات میں مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری کیا ہے‘‘۔

کعبہ توحید خالص کے لئے بنایا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے پہلے ہی دن کہہ دیا گیا تھا:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (الحج:۲۶)

ترجمہ: ''اور جبکہ ہم نے ابراہیم کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلادی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور میرے گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں کے لئے اور قیام، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔''

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (البقرۃ:۱۲۵)

ترجمہ: ''اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کی طرف حکم بھیجا کہ میرے گھر کو خوب پاک رکھو طواف کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔''

معلوم ہوا کہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کا حکم پہلے سے موجود تھا پھر ''**وثیابك فطھر**'' کے پہلے اور بعد کے فقرہ کو دیکھئے۔ پہلے کہا گیا: **قم فانذر** ...... ''اٹھو پس ڈراؤ۔ یہ ڈرانا کیا تھا شرک اور بت پرستی کے انجام ہی سے تو ڈرانا تھا۔ اس میں بتوں سے دوستی اور بت پرستوں سے دمسازی کا اظہار تھا یا بیزاری کا؟! بعد میں کہا گیا ''**والرجز فاھجر**'' ...... ''گندگی یعنی بتوں کو چھوڑ دو۔'' اس حکم کا منشاء کیا تھا۔ بتوں اور بت پرستوں سے ہم آہنگی کا اظہار کیا جارہا تھا یا کشمکش کی دعوت تھی!؟ مکہ ہی میں سورہ ''**قل ھو اللہ احد، قل یا ایھا الکفرون**'' کا نزول ہوا ہے۔ کیا ان آیتوں کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں تھا کہ کعبہ کے اندر بت رکھنے کا شرعی حکم کیا ہے۔ آخر وہ کون سی آیات ہیں جن میں کعبہ میں بت رکھنے کی شرعی حیثیت بتائی گئی تھی اور وہ کون سی آیات ہیں جن میں ۳۶۰ بتوں کی موجودہ حیثیت کو تسلیم کرنے اور گوارہ کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔

ایک دوسرے پہلو سے سوچئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل مکہ کے درمیان وجہ نزاع کیا تھی؟ جو قوم اتنی سیکولر مزاج تھی کہ ۳۶۰ بتوں کو گوارہ کر رہی تھی وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر بھڑک اٹھی، گھر گھر کشمکش برپا ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی زندگی اجیرن بنادی گئی۔ اپنا وطن چھوڑ کر دوسری جگہ انہیں جانا پڑا۔ ہجرت حبشہ ہوئی۔ اہل مکہ نے حبشہ تک پیچھا کیا۔ جب ان کو جعفر طیارؓ کی تقریر کے بعد ناکامی ہوئی تو انہوں نے اپنے ایک بڑے سردار عتبہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لالچ دلانے کے لئے بھیجا۔ عتبہ کی پیشکش کو دیکھئے۔ دولت اور اقتدار کی اس نے لالچ دلائی۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ٹھکرادی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک محض سکون اور چین

کی زندگی گزارنا اورعزت اور مرتبہ کی کوئی اہمیت ہوتی تو کتنا سنہرا موقع تھا۔ جب لالچ کی یہ تدبیر نہ چلی تب سارے قبیلوں کے سردار اکٹھے ہوئے اور آپ ﷺ کے چچا ابوطالب کے پاس آ کر یوں تقریر کی:

''ہم نے آپ کا بہت ادب کیا۔ آپ کا بھتیجا ہمارے ٹھاکروں اور بتوں کو جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے اتنا سخت سست کہنے لگا ہے کہ اب ہم صبر نہیں کر سکتے۔ آپ اسے سمجھا کر چپ رہنے کی ہدایت کر دیں ورنہ ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے اور تم اکیلے ہم سب کا کچھ نہیں کر سکو گے۔''

''سارے ملک کی عداوت دیکھ کر چچا کا دل درد اور محبت سے بھر گیا۔ انہوں نے نبی ﷺ کو بتایا اور سمجھایا کہ بت پرستی کا رد نہ کیا کرو۔ ورنہ میں بھی تمہاری کچھ حمایت نہیں کر سکوں گا۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''چچا اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر لا رکھیں اور چاند کو بائیں ہاتھ پر تب بھی میں اپنے کام سے نہ ہٹوں گا۔ اور خدا کے حکم میں سے ایک حرف بھی کم و بیش نہ کروں گا۔ اس کام میں خواہ میری جان بھی جاتی رہے۔''

ان حقائق کے باوجود اگر یہ کہا جائے کہ کعبہ میں بتوں کی شرعی حیثیت نہیں بتائی گئی بلکہ محض اخلاق سدھار کی بات کہی گئی تو کتنی غلط بات ہے اور اتنی خلاف حقیقت اور خلاف واقعہ بات کو اتنے زوردار انداز سے کہنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس وقت حالات چاہے کتنے ہی سخت ہیں مکہ کے حالات اس سے کہیں زیادہ سخت تھے اور مکہ میں مسلمانوں کی تعداد اور ان کے وسائل نسبتاً ہماری تعداد اور وسائل سے بہت کم تھے۔ نیز ہمارے مقابلہ میں باہری دنیا کی انہیں ہمدردیاں انتہائی کم حاصل تھیں۔ لیکن بت پرستی اور مورتی پوجا کے مسئلہ میں کسی طرح کا سمجھوتہ اور مفاہمت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ مارے گئے، پیٹے گئے، طرح طرح ستائے گئے اور مکہ سے نکال دیئے گئے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس بارے میں ذرّہ برابر نہ نرم ہوئے، نہ جھکے اور نہ انہوں نے اپنے اندر لچک پیدا کی۔

اس اسوۂ حسنہ کی روشنی میں آخر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمان ایک مسجد کو بت خانہ بنانے کی اپنی طرف سے پیشکش کریں یا اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کریں اور کہہ دیں کہ ہم کو کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ ہماری جان بخش دی جائے۔

(۴) ''چوتھی دلیل رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کا رویہ ہے ابرہہ کے مقابلہ میں۔''

سوال یہ ہے کہ عبدالمطلب کا عمل کوئی شرعی دلیل ہے؟ ان کا خاتمہ حالت شرک میں ہوا ہے۔ قرآن و حدیث میں ان کے رویہ کے صحیح ہونے کے لئے کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اس واقعہ کو دلیل شرعی

کے طور پر پیش کرنا کہاں کی دین فہمی ہے۔ یہاں ایک اور پہلو بھی خاص توجہ کا طالب ہے، عبدالمطلب نے صرف یہ کیا کہ کعبہ کی حفاظت کے لئے میدان میں نہیں آئے لیکن انہوں نے اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا نہ اپنی رضا کا اظہار کیا اور نہ کعبہ کی حرمت بیچ کر اپنے لئے کوئی مراعات حاصل کیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا کا سہ نکاتی فارمولہ کتنا گھناؤنا ہے کہ حالت شرک میں ہونے کے باوجود انہوں نے حرمت کعبہ کو بیچنا اپنی خودداری کے خلاف سمجھا اور ہم اتنے بے غیرت بن گئے ہیں کہ مسجد کی حرمت دے کر اپنے لئے تحفظ کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ اس دنائت اور پست ہمتی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

عبدالمطلب کا طرز عمل غیرت اور خودداری کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ غیر منطقی اور غیر عقلی بھی ہے اسی بناء پر بعض محققین نے اس واقعہ کی صحت میں بھی کلام کیا ہے جو بالکل بے وزن بھی نہیں ہے۔

ہر چیز اللہ کی ہے۔ ہمارا مال، ہماری جان، ہمارا دین، ہمارا قرآن اور ہمارا قبلہ سب اللہ کا ہے تو کیا آپ مسلمانوں کو یہی درس دیں گے کہ کسی چیز کی حفاظت اور صیانت کے لئے کچھ نہ کرو۔ اللہ خود اپنی چیز کی حفاظت کرے گا۔ دیکھو کعبہ جیسی باعظمت چیز کی حفاظت عبدالمطلب نے خود نہیں کی، بلکہ اللہ کی چیز تھی لہٰذا اس کی حفاظت اللہ ہی کے ذمہ کردی۔ تم بابری مسجد کے چکر میں کیوں پڑے ہو۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو من قتل دون ماله فهو شهيد...... ''جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے۔'' آپ نے کیوں فرمایا۔ قرآن میں كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ...... ''تم پر جنگ فرض کی گئی'' کس بناء پر فرمایا گیا۔ جہاد کو افضل الاعمال کیوں بتایا گیا اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے پر بار بار کیوں ابھارا گیا۔ عہد نبوی میں درجنوں معرکے کیوں گرم ہوئے۔ اور میدان جنگ میں مقابلہ سے فرار کو منافی ایمان کیوں قرار دیا گیا؟؟

معلوم ہوا کہ یقیناً ہر چیز اللہ کی ہے اور وہی ہر چیز کی حفاظت کرنے والا ہے۔ مگر انسانوں پر امتحاناً کچھ ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اس کی عدم ادائی کی صورت میں ہم ناکام اور مجرم قرار دیئے جائیں گے۔

⑤ پانچویں دلیل "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق، یعنی کسی مومن فرد یا گروہ کے بس میں جتنا کچھ ہو صرف اتنے کیلئے ہی وہ مکلف ہے۔ اپنے بس سے باہر کی ذمہ داری کسی مسلم فرد یا مسلم گروہ کے اوپر نہیں۔ اس شرعی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے بابری مسجد اور مسلمانوں کے مسئلہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اب اس معاملہ میں مسلمانوں کی کوئی شرعی ذمہ داری نہیں ہے۔

اگر ان کے اوپر بابری مسجد کے تحفظ کی ذمہ داری تھی تو وہ اس ذمہ داری کو قربانی کی حد تک جا کر ادا کر چکے ہیں۔ انہوں نے پوری طاقت کے ساتھ بابری مسجد کو بچانا چاہا مگر وہ اس کو نہ بچا سکے‘‘۔ (الرسالہ)

اس استدلال میں کئی ایک خامیاں ہیں:

① اس استدلال سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ مسلمانوں نے اپنے بس بھر کوشش کی ہے اللہ کے نزدیک ان سے اب باز پرس نہیں ہوگی وہ معذور ہیں۔ اس سے آگے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان بابری مسجد کے انہدام کو قبول کرلیں اور راضی نامہ لکھ کر دے دیں۔ اور اس کے عوض اپنی جان کی امان چاہیں۔ جب یہ طے ہے کہ وہ جگہ ہمیشہ مسجد کی جگہ رہے گی تو مسجد کی جگہ دوسروں کے حوالہ کرنے کا جواز اس اصول سے کس طرح ثابت ہوتا ہے۔

② آدمی کے بس میں کیا ہے کہاں تک ہے اس کا فیصلہ تو آخرت میں ہوگا کہ کس کو کیا کرنا تھا اور اس نے کیا کیا۔ ظاہری طور سے اس دنیا میں آدمی کی آخری سانس اس کے بس کی آخری حد ہے جو ٦ر دسمبر سے پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ یقیناً ان کے بارے میں ہم ظاہری طور سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے بس میں جو تھا انہوں نے کیا لیکن جو لوگ ٦ر دسمبر کے بعد اب تک زندہ ہیں یا جب تک آئندہ زندہ رہیں گے ان کو اپنی آخری سانس تک کا حساب دینا ہوگا کہ ان کے بس میں کیا تھا اور انہوں نے کیا کیا۔ مولانا کا استدلال بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نماز کے لئے مسجد کے راستہ پر نکلا۔ راستے میں کتا بیٹھا تھا۔ بس تھوڑا انتظار کیا اور ڈر کر واپس آ گیا اور اس کے بعد مطمئن ہو گیا یہ سوچ کر کہ میرے بس میں جو تھا میں نے کرلیا اور میں معذور ہوں۔ لیکن قیامت کے دن اگر اس سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے گھر میں ڈنڈا تھا۔ ڈنڈے سے کتے کو کیوں نہیں بھگایا تو وہ آدمی کیا جواب دے گا اور کیا وہ اپنے کو معذور ثابت کر سکے گا؟! حقیقت یہ ہے کہ ایک کام چور طالب علم تو اس طرح کا استدلال کرسکتا ہے کہ میں نے ایک بار امتحان دیا، فیل ہو گیا۔ بس بھر کوشش کر لی اب آئندہ میں کچھ نہ کروں گا۔ لیکن ایک سچا اور محنتی طالب علم ایک بار کوشش کے بعد دوبارہ کوشش کرنے سے ہمت نہ ہارے گا۔ الغرض مولانا کا استدلال بہانہ بازوں اور نکموں کا استدلال ہوسکتا ہے لیکن بابری مسجد کے مخلصین اور باہمت لوگوں کا نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں اپنا جائزہ لیجئے آپ کے سامنے ایک انتہائی چھوٹا مذہبی گروہ اپنی عبادت گاہ کو بچانے کے لئے کیا کیا قربانیاں پیش کر چکا ہے۔ عین موقع پر سینکڑوں نے اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔ اپنے معمولی معمولی مطالبہ

کے لئے ہزاروں افراد جیل جاتے ہیں اور برسوں صعوبتیں جھیلتے ہیں۔ ہزاروں گردنیں کٹا دیتے ہیں۔ ہم اپنی تعداد، اپنے وسائل کا حساب لگائیں اس میں سے کتنے فیصد ہم نے لگایا ہے عین موقع پر جبکہ مسجد ڈھائی جارہی تھی فی کروڑ ایک آدمی بھی جا کر گولی کھا کر شہید ہو گیا ہوتا تو کہا جاسکتا تھا کہ ہمارے بس میں جو تھا ہم نے کر دکھایا۔ پوری ملت دوسروں پر تکیہ کئے ہوئے اپنے گھر میں بیٹھی رہی۔ اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ ہم نے اپنا حق ادا کر دیا ہے، نفس کو دھوکہ دینا ہے۔ یہ ایک قومی اور ملی جرم ہے جو ہم سے سرزد ہوا ہے۔

اس کے وبال سے بچنے کی صورت یہ تھی کہ ہم متحد ہوتے، مستعد ہوتے اور از سرنو مسجد کی تعمیر کے لئے ہندوستانی ملت کے شایان شان کوششوں اور قربانیوں کا نذرانہ بارگاہ رب العزت میں پیش کرتے اور اس سے اپنی کوتاہی کی معافی چاہتے۔ اس کے برعکس انہدام مسجد کو اپنے تحفظ کے لئے بطور فدیہ ہم پیش کر رہے ہیں۔ غیرت ایمانی اور حمیت دینی سے اگر ہم خالی ہو گئے ہیں تو کم از کم اس کا خیال تو ہونا چاہئے کہ آئندہ مؤرخ ہمارا تذکرہ کس انداز میں کرے گا۔ پھر بالفرض ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ تک آپ نے بس بھر کوشش کی۔ لیکن مسجد گرادی گئی۔

سوال یہ ہے کہ اس کے بعد آپ کے بس میں جو کچھ ہے وہ کیوں نہیں کریں گے اور آپ پر کیوں ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ یہ مانا کہ آپ یعنی مسلمان بے بس ہیں معذور ہیں تو مسجد کی ذمہ داری دنیا کے دوسرے مسلمانوں پر آئے گی۔ آپ ان سے کہئے کہ آپ اس ذمہ داری کو سنبھالو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ مختصر یہ کہ آپ مسجد کی حفاظت سے، صیانت سے اور تعمیر سے عاجز ہو کر بیٹھ سکتے ہیں لیکن اس کی حوالگی کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ اللہ آپ کے علاوہ کسی دوسری قوم کو اپنے گھر کے لئے اٹھائے جو ہمارے جیسے کمزور اور معذور نہ ہوں۔

مسجد کی جگہ تو اللہ کی ملکیت ہے اس میں مسلمان اپنی طرف سے کوئی تصرف نہیں کر سکتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کسی مسلمان کے لئے کیا جائز ہوگا اور اس کی غیرت گوارا کرے گی کہ اپنی جگہ اور اپنا گھر بت پوجا کے لئے قیمتاً یا کسی معاہدہ کے تحت برضا ورغبت حوالہ کرے اور اگر کوئی چھاگلہ عبدالحمید دلوائی اور عباس نقوی قماش کا فرد اپنے کو سیکولر ثابت کرنے کے لئے ایسی حرکت کرے تو اس کی مسلمانیت باقی رہے گی۔ افسوس کا مقام ہے جس حرکت کا تصور ایک ناخواندہ اور بے عمل مسلمان نہیں کر سکتا اس کو تقاضائے شریعت ثابت کرنے کے لئے ہمارے دانشور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اور آیات اور احادیث کی غیر عقلی، غیر منطقی اور غیر دینی تاویلات کر رہے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اس کے پیچھے بے شعوری، بے عملی ہے یا کچھ دوسرے محرکات۔

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

⑥ چھٹویں دلیل: ''حقیقت یہ ہے کہ ۶ ردسمبر کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس معاملہ میں اب مسلمانوں کے لئے جو انتخاب ہے وہ بابری مسجد بنانے اور بابری مسجد نہ بنانے کے درمیان نہیں ہے بلکہ بابری مسجد اور ملت کی تباہی کے درمیان ہے۔ یعنی مسلمان اگر دوبارہ اسی مقام پر بابری مسجد تعمیر کرنے کی مہم چلائیں تو اس کے نتیجہ میں یہ ہونے والا نہیں ہے کہ بابری مسجد اپنے اصل مقام پر بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے برعکس جو ہوگا وہ یہ کہ انڈیا کے مسلمان ناقابل بیان تباہی میں پھنس کر رہ جائیں۔

یہاں میں آپ کو ایک اور شرعی حکم یاد دلاتا ہوں جو بہت زیادہ اس مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس حکم کو قرآن کی زبان میں اضطرار کہا جاتا ہے مثلاً خنزیر کا گوشت کھانا اسلام میں مطلق حرام ہے۔ لیکن اک شخص اگر مضطر ہو جائے یعنی وہ ایسی صورت حال میں مبتلا ہو جائے کہ اس کے پاس کھانے کے لئے صرف خنزیر کا گوشت ہو، اس کے لئے دو میں سے ایک کو انتخاب کرنے کا موقع ہو، یا تو وہ خنزیر کا گوشت کھا کر اپنی جان بچائے یا پھر بھوک سے مرجائے۔ ایسی حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس آدمی کو خنزیر کا گوشت کھا لینا چاہئے۔ کیونکہ جان بوجھ کر اپنے کو ہلاک کرنا اسلام میں جائز نہیں۔

اس شرعی اصول کی روشنی میں دیکھئے تو آج یہی نازک مسئلہ انڈیا کے پورے مسلم گروہ کے لئے پیدا ہو گیا ہے۔ پھر جو شریعت ایک جان کو بچانے کے لئے حرام غذا کو حلال کر دیتی ہے، وہ شریعت کیا بارہ کروڑ انسانوں کے لئے ایک مسلم گروہ کو ہلاکت سے بچانے کے لئے انہیں کوئی رعایت نہ دے گی۔'' (الرسالہ)

اس استدلال پر غور کیجئے۔ یہاں نقطۂ نظر کا ایک زبردست فرق ہے۔ ایک بے غیرت اور بزدل جس زندگی کو باعزت زندگی سمجھتا ہے غیرت مند اور بہادر اس کو موت خیال کرتا ہے۔ بہن بیٹیوں کی عصمت برسرعام لٹتے ہوئے دم سادھے اپنے کو بچا کر کوئی اپنی ہوشیاری تصور کرتا ہے اور کوئی دوسرا ایسی حالت میں اپنے لئے زمین کی پیٹھ سے بہتر زمین کے پیٹ کو خیال کرتا ہے۔ منافق جس چیز کو زندگی سمجھتا ہے مومن کی نظر میں وہ موت ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اِسی ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

مسلمانی نظریۂ زندگی قرآن میں یوں بیان ہوا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ۔ (البقرة:۱۵۴)

ترجمہ: ''اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں تم انہیں مردہ مت کہو۔''

یعنی زندگی اصل میں اللہ کے لئے اپنے آپ کو کھپانا ہے اور حق کے لئے راہ خدا میں شہید ہو جانا ہے۔ آلام و مصائب اور مشکلات و آزمائشوں کو حق کے نام پر انگیز کرنا ہے نہ کہ مشکلات سے ڈر کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ جانا۔ اس چیز کو قرآن میں مختلف مقامات اور مختلف انداز سے مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. (البقرۃ:۱۹۵)

ترجمہ: ''اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

اس آیت کو بعض لوگ بالکل الٹے مفہوم میں لیتے ہیں۔ حالانکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے سے جی چراتے ہیں بظاہر تو وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خطرات اور مشکلات سے بچا رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہلاکت و بربادی کے جہنم میں جھونک رہے ہوتے ہیں۔ مومن کے لئے زندگی اور بقاء کا اصلی خزانہ خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی ہے نہ کہ جان و مال کو سینت سینت کر رکھنے اور بچانے میں۔ سورۂ توبہ میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ. (التوبۃ:۴۲)

ترجمہ: ''اور وہ عنقریب اللہ کی قسم کھائیں گے کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ آپ کے ساتھ نکلتے وہ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔''

اس آیت میں ''يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ'' کے الفاظ سے کنجوسی اور بزدلی کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس حالت کو منافقین زندگی اور کامیابی سمجھتے ہیں اللہ کی نظر میں وہ موت اور ہلاکت ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات، کشمکشِ انقلاب

مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ بابری مسجد کے ایشو سے وابستہ نہیں ہے۔ یہ ایشو ختم ہوگا تو کوئی دوسرا ایشو پیدا کر لیا جائے گا۔ اس کے پہلے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزارہا فسادات مختلف ایشوز کے تحت ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ فسادات اور مشکلات کا خوف دلا کر مسلمانوں کو ذلت اور مسکنت کے کس کھڈ میں آپ گرانا چاہتے ہیں؟ حق یا باطل صحیح یا غلط کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے کی تلقین کرنا اور ترغیب دینا الگ بات ہے لیکن خوف اور ڈر کی بنیاد پر کسی موقع پر مسلمانوں کو جھکانا نہایت خطرناک چیز ہے جس گروہ کے اندر یہ ذہنیت پیدا ہو جائے گی اس کو دنیا کی کوئی طاقت بھی عزت کے مقام پر نہیں بٹھا سکتی۔ عزت و وقار کا منبع ایمان و یقین کے ساتھ اعلیٰ ظرفی، بلند خیالی اور علوہمتی ہے۔ مسلمانوں کو خیر امت اور اعلون ہونے کا اذعان دیا گیا کیونکہ ذہن و دماغ جس کے مرعوب ہوں گے وہ گروہ دوسروں کے مقابلہ میں کیا کھڑا ہوگا!

نبی ﷺ کے ارشاد میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جبکہ دوسری قومیں مسلمانوں پر

ایسے ٹوٹ پڑیں گی جیسے بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ پوچھا گیا اس وقت ہماری تعداد کیا بہت کم ہوجائے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا نہیں۔ تعداد کثیر ہوگی لیکن تم جھاگ کے مانند ہوگے اور تمہارے اندر وہن پیدا ہوجائے گا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ وہن کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بتایا ''حب الدنیا و کراھیة الموت''، یعنی دنیا کی محبت اور موت کو ناپسند کرنا۔ اس روشنی میں جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ باعزت زندگی اور تحفظ حاصل ہونے کے لئے بنیادی صفت مشکلات کے اندیشے اور موت کے ڈر سے حمایت حق کو چھوڑنا نہیں ہے بلکہ دنیا اور دنیا کی زندگی کو ناچیز اور ہیچ سمجھنا اور موت سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ ہے۔ یہ حوصلہ اگر ختم ہوجائے تو مسلمان کی حیثیت کیا رہ جائے گی۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

مسجد تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر مانی ہوئی اور قابل احترام چیز ہے۔ اگر مرعوبیت اور ڈر کی وجہ سے اس کے لئے بھی ڈٹ کر کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو وہ کسی چیز کے لئے اور کسی موقع پر بھی کھڑے نہیں ہوسکتے۔ ترشول اور تیر دیکھ کر ایک مسجد حوالہ کریں گے تو دوسری اور تیسری مسجد محض ڈنڈا ہی دیکھ کر چھوڑ دیں گے اور چوتھی کا جب مسئلہ پیش ہوگا تو ایک ڈانٹ اور ایک دھمکی ان کے لئے کافی ہوگی۔ بلکہ اس کے بعد یہ نوبت آسکتی ہے کہ مسلمان اپنے ہاتھوں مسجدوں کو توڑیں گے اور اپنے پیسوں سے بت خانہ تعمیر کریں گے کیونکہ ان کے تصور میں اس کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہ ہوگا۔

بابری مسجد کے محاذ پر ۲۰ کروڑ مسلمان ہار مان کر مرعوب ذہنیت کے ساتھ اپنی زندگی بچانے کے لئے مسجد کو بت خانہ بنانا برضا و رغبت قبول کرلیں تو صدیوں ان کے اندر زندگی اور بلند ہمتی پیدا ہونا مشکل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ فرعونی ذہنیت کے سامنے بنی اسرائیل نے جب سپر ڈال دی اور ہمت ہار گئے تو ان کی پستی کا یہ حال ہوگیا کہ اللہ کا نبی کہتا ہے کہ سامنے والی قوم سے لڑ جاؤ، اللہ تمہیں ضرور غالب کرے گا لیکن وہ کھڑے نہ ہوسکے اور جواب دیا:

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (المائدۃ:۲۴)

ترجمہ: ''(یعنی) تم اور تمہارے اللہ میاں جا کر لڑیں، ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

بنی اسرائیل کا کوئی نرالا واقعہ نہیں ہوا ہے بلکہ غلامانہ اور مرعوب ذہنیت کا یہ خاصہ ہمیشہ رہا ہے۔ مرعوب ذہن کے ایک جوان کو ایک عورت کہتی ہے کہ یہیں کھڑے رہو میں ابھی گھر سے تلوار لے کر آتی ہوں۔ چنانچہ وہ

تلوار لے کر آتی ہے اور اس کو قتل کر دیتی ہے اور اس جوان کو بھاگنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ تاریخ میں ایسا ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔

خوف کی بنیاد پر مسجد کی سپردگی کی صورت میں یہ انجام ہونے والا ہے تاریخ کے اس عمل کو روکا نہیں جا سکتا۔ اس کے برخلاف اس محاذ پر مسلمان اگر جمے اور ڈٹے رہتے ہیں تو دو امکان ہیں: ایک یہ کہ اس سے ان کے اندر زندگی پیدا ہوگی اور ان کے حوصلے بلند ہو سکتے ہیں اور عین ممکن ہے کہ سامنے والے گھٹنے ٹیک دیں۔ اگر انگریز قوم مجاہدین آزادی کے سامنے اور روس جیسی سپر طاقت افغانیوں کے سامنے جھک سکتی ہے تو کیوں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ مسلمان کچھ نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض ایسا نہ بھی ہوا تو اتنا ضرور ہوگا کہ مسلمانوں کی دوسری چیز پر ہاتھ اٹھانے کے لئے انہیں سو بار سوچنا پڑے گا۔ اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس راہ میں مسلمان جان و مال کی جو قربانی دیں گے وہ رحمت خداوندی کو ان کی طرف متوجہ کرنے والی ہوگی۔ اور آخرت میں نجات وفلاح کا ذریعہ ہوگی۔ غرض اس راہ میں ڈٹ کر جو وہ پائیں گے اس سے بہت زیادہ ہوگا جو پیچھے ہٹ کر اور مسجد دے کر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی صورت میں دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی ہے اور دوسری شکل میں دنیا کی سرخروئی اور سربلندی کی امید ہے اور آخرت کی کامیابی یقینی ہے۔ ان وجوہ کی بناء پر یہ کہنا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ مسجد کا ایشو دو دو چار کی طرح مسلمانوں کی تباہی کا سبب ہے۔ یہ کہنے والے ذرا سوچیں کس امت کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں! یہ تو وہ امت ہے جو تلواروں کے سایے میں پیدا ہوئی ہے اور تیغوں کے سایے میں پروان چڑھی ہے۔ جس کی ایک شاندار تاریخ ہے جس کے آباء واجداد نے حق گوئی و بے باکی کا ہر زمانہ میں تسلسل قائم رکھا ہے۔

براہ کرم اس تسلسل کو توڑیئے نہیں۔ خطرات اور مشکلات سے پامردی کے ساتھ نمٹنے کا اس کو درس دیجئے، ڈرایئے نہیں۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اس گئی گزری حالت میں فلسطینی مسلمان تقریباً نصف صدی سے یہودی استعمار سے نبرد آزما ہیں اور نہتے افغانی مسلمانوں نے روس جیسی طاقت کا چودہ سال تک مقابلہ کیا اور آخر کار اس کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ تو آخر کیا وجہ ہے کہ بیس کروڑ ہندوستانی مسلمان یہودیوں کے بھائی فرقہ پرستوں کے سامنے اتنے کمزور ثابت ہوں گے کہ وہ آناً فاناً ان کو ہڑپ لے جائیں گے۔

بہرحال اضطرار کا شرعی اصول ایک رخصت ہے کہ ایک آدمی ایک حرام چیز کھا کر اپنی جان بچا لے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ملت اسلامیہ پر ویسی ہی اضطراری حالت طاری ہے جس میں خنزیر کھائے بغیر ایک آدمی زندہ باقی نہیں رہ سکتا؟ بابری مسجد حوالہ کئے بغیر ملت کا وجود باقی نہ رہے گا کیا یقینی بات ہے؟ کیا ملت نے اپنے تحفظ

کی ساری تدبیریں اختیار کرلی ہیں۔اس کے لئے اب تمام راہیں بند ہوچکی ہیں؟ کیا وہ اس وقت اتنی بے دست وپا ہوچکی ہے کہ اگر فوری مسجد سے دستبرداری اختیار نہ کی تو یکلخت سب کے سب فنا کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے؟ ہمیں پورا یقین ہے کہ دنیا کا کوئی تجزیہ نگار، موجودہ حالات کے تناظر میں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ سو سال تک ملت مزاحمت کرتی رہے تو بھی یہ اضطراری مرحلہ نہ آئے گا۔ مشکلات اور مصائب کا ہجوم اضطرار کی تعریف میں نہیں آتا۔

مکہ میں شعب ابی طالب میں تین سال تک اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم محصور کردیئے گئے۔ ہرطرح ان کا بائیکاٹ کیا گیا۔ بھوکوں مرنے کی نوبت تھی، سوکھے چمڑے چوس چوس کر پانی پیتے تھے۔لیکن اس حالت کو بھی حالت اضطرار قرار دے کر توحید پرستی کے مسئلہ میں کسی نرمی اور جھکاؤ کا اظہار نہیں کیا گیا۔ مدینے میں پورے عرب کے قبائل امڈ کر آ گئے۔ مدینہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ باہر سے کوئی کمک آسکتی تھی نہ کوئی رسد۔ صحابہ کرامؓ کو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پیٹ پر پتھر باندھنے کی نوبت آئی مگر کہیں سے حالت اضطرار کی رخصت سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

اس سلسلہ کی آخری بات جو نہایت ہی اہم ہے وہ یہ ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں کسی واقعہ کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جس میں پوری ملت نے محض جان بچانے کے لئے کسی معصیت کا ارتکاب کیا ہو یا شعائر اسلامی کے کسی جزو کی بے حرمتی کی قیمت پر اپنے آپ کو بچایا ہو۔وجہ یہ ہے کہ ایک مضطر آدمی خنزیر کا گوشت نہ کھائے اور مرجائے تو یہ خودکشی اور حرام موت ہوگی۔لیکن کسی اسلامی قابل احترام چیز کی حفاظت میں کوئی شخص اپنی جان دے دیتا ہے تو وہ شہید ہوگا۔ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔لہٰذا اضطرار کی شرعی اجازت سے مسجد کے بارے میں استدلال کرنا نہایت غلط اور بالکل الٹی بات ہے۔

> (۷) ساتویں دلیل: ''صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما... ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جب بھی دو امر میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپؐ ہمیشہ آسان کا انتخاب فرماتے۔''
>
> اس حدیث کو سامنے رکھ کر سوچئے تو اس وقت مسلمانوں کے لئے دو میں سے ایک چیز کے انتخاب کا موقع ہے۔ایک یہ کہ بابری مسجد کے ایشو سے خود کو الگ کرکے اس کو ملک کے ضمیر کے حوالہ کردیں۔ دوسرے یہ کہ بابری مسجد کے لئے وہ اپنی لڑائی جاری رکھیں۔ دونوں صورتوں کا تقابل کیجئے تو یقینی طور پر پہلی صورت آسان اور دوسری صورت انتہائی مشکل ہے۔ایسی حالت میں عین سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تقاضہ ہے کہ مسلمان آسان صورت کو اپنالیں اور مشکل صورت کو چھوڑ دیں۔'' (الرسالہ)

یہ استدلال بغیر سوچے سمجھے پیش کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جب دو جائز امر میں انتخاب کا اختیار دیا گیا تو

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں سے آسان کو اپنایا۔ اس موقع پر مولانا کو کوئی ایسی روایت پیش کرنی چاہئے تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک غلط اور دوسری صحیح چیز کے درمیان اختیار دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غلط کو نعوذ باللہ اختیار کر لیا ہو۔ اہل مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دولت اور اقتدار کو ایک طرف رکھا اور دوسری طرف بتوں کی تردید کی صورت میں جان سے مار دینے کو رکھا اور کہا کہ اس میں جس کو چاہو قبول کر لو۔ بتایئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس چیز کا انتخاب کیا؟ زیر بحث معاملہ میں تو آپ بھی بابری مسجد سے دستبرداری کو سور کے گوشت کے درجہ میں رکھتے ہیں۔ تو غور فرمایئے اس معاملہ میں حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے استدلال کیونکر صحیح ہوگا۔

اس روایت میں دو جائز چیزوں میں سے آسان ترین کے انتخاب کی بات ہے اور یہاں جائز اور ناجائز کے درمیان انتخاب کا سوال ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری حدیث مولانا کے سامنے نہیں تھی، ورنہ اس موقع پر اس حدیث سے قطعاً استدلال نہیں کرتے۔ اس لئے کہ حدیث میں صاف لفظوں میں بتا دیا گیا ہے کہ یہ اس صورت کی بات ہے جبکہ گناہ نہ ہو۔ گناہ کا کام ہوتا تو آپ اس سے دور بھاگتے۔ اس کے انتخاب کا سوال نہیں ہوتا۔

بخاری میں "اختار" کے بجائے "اخذ" کا لفظ آتا ہے اور حاشیہ میں ہے کہ جب سہل اور آسان کام گناہ کا سبب ہوتا تو آپ مشکل ترین کا انتخاب فرماتے۔ مسلم شریف میں یہی حدیث الفاظ کے تھوڑے تغیر کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ امام مسلم نے اس پر جو باب باندھا ہے اس میں صراحت کر دی ہے کہ یہاں انتخاب کی بات دو مباح چیزوں کے درمیان ہے۔ پوری حدیث یوں ہے:

ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بین امرین الا اخذ ایسرھما مالم یکن اثما فان کان اثما کان ابعد الناس منہ وما انتقم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لنفسہ فی شیء قط الا ان تنتھک حرمۃ اللہ فانتقم للہ بھا۔

ترجمہ: ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو امر کے درمیان اختیار نہیں دیا گیا۔ مگر ان میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آسان ترین کو اختیار فرمایا۔ جبکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے سب سے زیادہ دور ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی معاملہ میں انتقام نہیں لیا۔ اِلاّ یہ کہ اللہ کی محترم ٹھہرائی ہوئی کسی چیز کی حرمت پامال کی جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے لئے انتقام لیتے۔''

(۸) آٹھویں دلیل: ''اس روش کو اختیار کر کے مسلمان کوئی نئی بات نہیں کریں گے۔ وہ وہی کریں گے جس پر وہ تقریباً پچاس سال سے اس ملک میں عمل کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے پنجاب، ہریانہ اور راجستھان میں ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئیں۔ مختلف طریقوں سے ان کی بے حرمتی کی گئی۔ مگر مسلمانوں نے کبھی بھی ان مسجدوں کے نام پر کوئی ایجی ٹیشن نہیں چلایا۔ کیوں کہ اس معاملہ میں انہوں نے اپنے کو مضطر پایا تھا۔ اب اگر

وہ بابری مسجد کو بھی اسی فہرست میں شامل کرلیں تو یہ عین وہی ہوگا جس پر اس سے پہلے عملاً قائم رہے ہیں۔

میں نے جو تین نکاتی فارمولہ پیش کیا ہے وہ باعتبار حقیقت کوئی نئی چیز نہیں، یہ ایودھیا کی مسجد کے معاملہ میں اسی اصول کو باعزت طور پر لاگو کرنا ہے جو عملاً ملک کی ہزاروں مسجدوں کے بارے میں تمام علماء کی مرضی سے اختیار کیا جاچکا ہے۔'' (الرسالہ)

بظاہر یہ استدلال بڑا خوشنما ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے انتہائی بودا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی غلط نمونہ کو دوسرے غلط کام کے لئے دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی مفتی کسی شخص کو نماز نہ پڑھنے کی اجازت دے اور اس فتویٰ کی بنیاد یہ بتائے کہ لاکھوں مسلمان نماز نہیں پڑھتے اور تمام علماء کی مرضی اسی میں شامل ہے تو اس آدمی کو بھی انہیں لاکھوں میں شامل سمجھو۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہزاروں مسجدوں کے بارے میں مسلم لیڈران، علماء، اور مختلف مسلم تنظیموں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور زبانی اور تحریری احتجاج کیا ہے۔ البتہ بڑے پیمانہ پر کوئی مہم نہیں چلائی گئی ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ مسلمانوں کی مرضی شامل ہے، بے بنیاد بات ہے۔ بابری مسجد منہدم کردی گئی۔ مسلمان آج جتنا خاموش ہیں کل اس سے زیادہ خاموش ہوجائیں گے۔ ان کی یہ خاموشی اللہ کے نزدیک کس خانہ میں رکھی جائے گی نہیں معلوم، لیکن سہ نکاتی فارمولہ انہدام مسجد اور تعمیر بت خانہ پر مسلمانوں کی رضامندی کے اظہار کا مطالبہ کرتا ہے اور دھمکی دے رہا ہے کہ ایسا تم نہ کروگے تو نیست و نابود ہوجاؤگے اور فرقہ پرستوں کی جارحانہ کارروائی میں بالواسطہ مسلمانوں کو شریک بنانا چاہتا ہے۔ ظلم سہنا، مظلوم بن کر رہنا اور ظلم پر خاموشی اختیار کرنا جائز ہوسکتا ہے لیکن ظالم کے ظلم پر صاد کہنا، ظالم کی ہمنوائی کرنا اور اس کے عوض کوئی مفاد حاصل کرنا انتہائی بھاری جرم ہے۔ ظلم کو ظلم اور ظالم کو ظالم کہنا ملت اسلامیہ کی زندگی کی علامت ہے۔ اگر کسی بھی دور میں یہ امت پوری کی پوری حق کے لئے قربانی اور بےخوفی کے جذبے سے خالی ہوجائے تو وہ اس کے انتہائی زوال اور پستی کا دور ہوگا۔ پھر وہ خدا کی رحمت سے دور ہوجائے گی اور کوئی چیز اس کو تباہی سے نہ بچاسکے گی۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد میں بیان کی گئی ہے:

''جب تم دیکھو کہ میری امت ظالم کو ظالم کہنے سے ڈر رہی ہے تو سمجھ لو کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔''

یعنی رحمت خداوندی کا سایہ اس سے ہٹ گیا ہے۔ اب وہ خدا کے عذاب میں گرفتار ہوگی۔

بابری مسجد کو منہدم کرنے والے قرآن کی رو سے ظالم ہی نہیں بلکہ اظلم ہیں۔ ان کے ظالمانہ اقدام پر کوئی غیرت مند مسلمان یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔